ISHAR

H. NAIM

اشعار

حسن نعیم

شالیمار پبلیکیشنز
B/287 نیا ملک پیٹھ حیدرآباد — 36

زیر اہتمام	-	محمود خاور
قیمت	-	۸ روپے
سرورق	-	اسماعیل آرٹسٹ
خوشنویس	-	محمد غالب
مطبع	-	نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حی
تعداد اشاعت		ایک ہزار
سنہ اشاعت		نومبر ۷۱ء

ناشر

شالیمار پبلیکیشنز

B/287 نیا ملک پیٹھ حیدرآباد-36

برادرانِ محترم،

سید اکبر حسین اور سید علی نعیم کی نذر

جو خزانہ عیش کا مل سکا، اسے گھر کے ساتھ جلا دیا

جسے بچا کے رکھا تھا نقدِ غم، ترے پاس آ کے لُٹا دیا

روح کا لمبا سفر ہے ایک بھی انساں کا قرب
میں چلا برسوں تو اِک تک جسم کا سایہ گیا

اشعار

منتخب غزلیں

حسن نعیم

ملنے کے پتے

۱۔"شالیمار پبلیکیشنز" 8/287 نیا ملک پیٹھ۔ حیدرآباد۔ 36

۲۔ دفتر "برگِ آوارہ" ہفت روزہ ترپ بازار۔ حیدرآباد۔ ۱

۳۔ ادبی ٹرسٹ بک ڈپو۔ کنارا بنک۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد۔ ۱

۴۔ نیشنل بک ڈپو۔ چار کمان۔ حیدرآباد۔ ۲

۵۔ مکتبہ جامعہ۔ جامع مسجد۔ دہلی

۶۔ "نصرت پبلیکیشنز" لکھنؤ۔

۷۔ کلچرل اکاڈمی۔ گیا۔ (بہار)

۸۔ آزاد کتاب گھر۔ ساکچی بازار۔ جمشید پور۔ ۱

ترتیب

صفحہ

ترتیب

ترتیب

ترتیب

صفحہ

چند سطریں

میں "شالیمار پبلیکیشنز" سے کسی ایسے شاعر کا کلام شائع کرنا چاہتا تھا جس نے خورشید احمد جامی ہی کی طرح اپنی زندگی کا سارا لہو غزل کو سنوارنے، نکھارنے اور اسے ایک نئی تابندگی دینے میں صرف کیا ہو۔

میری نظر بار بار حسن نعیم پر پڑ رہی تھی۔ لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ اس سلسلہ میں ان کا اپنا کیا رویہ یا پلان ہے، حسنِ اتفاق سے ادھر دو مرتبہ مجھے "برگِ آوارہ" کے سلسلے میں دلّی جانے کا اتفاق ہوا اور دونوں بار میرا ان کا کافی ساتھ رہا۔ مختلف وقتوں میں شعر و ادب کے علاوہ بہت سے دوسرے موضوعات پر تبادلۂ خیال کا موقع ملا اور مجھے اس نتیجے پر پہنچنے میں کوئی دقّت نہ ہوئی کہ ان کے اشعار کی طرح ان کی شخصیت بھی شگفتہ، جاذب اور تہہ دار ہے۔

پہلی ہی ملاقات میں یہ بھنک میرے کان میں پڑ چکی تھی کہ وہ اپنی غزلوں کا کوئی مجموعہ یا انتخاب بغرضِ اشاعت ترتیب دے رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ جلد ہی چھپ جائے۔ لیکن اس موضوع پر پہلی بار میری ان کی گفتگو نہایت سرسری ہی ہو سکی اس لئے کہ کسی

تفصیل میں جانے سے پہلے ہی انہوں نے باتوں کا رخ پلٹ دیا، کسی بات کو خوبصورتی سے ٹال جانے کا فن بھی انھیں آتا ہے۔

دوسری بار جب میں وہاں گیا تو ترتیب کا کام تو آگے نہیں بڑھا تھا لیکن وہ اس موضوع پر کھل کر بات کرنے لگے تھے اور ان کے قریبی احباب بھی کتابت وطباعت کے مسئلے پر ان سے پوچھ گچھ کرتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ایک شام کچھ ایسا ہوا کہ جب ہم دونوں کسی شعری نشست سے واپس "ایوانِ غالب" لوٹ رہے تھے تو میں نے صاف الفاظ میں اپنی پیشکش ان کے سامنے رکھ دی جسے کچھ ردوقدح کے بعد انہوں نے قبول کر لیا اور اس طرح یہ مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ان کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ کوئی "گرد پوش" جلد کے ساتھ نہ ہو اور کسی نقاد یا مبصر کی رائیں کتاب کے ساتھ شائع نہ ہوں۔ اس لیئے کہ یہ رائیں شاعر کو کسی محدود دائرہ میں رکھ کر دی جاتی ہیں، لیکن انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ خود چند موٹی موٹی باتیں اپنی غزلوں کے تعلق سے لکھ کر دیں گے جسے میں بطور حرفِ آغاز شائع کر سکتا ہوں۔ چنانچہ قدرے انتظار کے بعد 'منظر و پس منظر' کے عنوان سے ان کا ایک مختصر لیکن نہایت معنی خیز مضمون موصول ہوا جو شریکِ اشاعت ہے۔

انھیں پابندیوں کی بنا پر میں بھی حسن نعیم کے کلام پر اپنے تاثرات لکھنے سے گریز کر رہا ہوں، پھر بھی اتنا لکھے بغیر چارہ نہیں کہ ان کے اشعار میں ایسی HAUNTING کیفیت ہے اور ان کے افکار میں ایسی دل نوازی ہے جن کے اسباب مدتوں ڈھونڈے جائینگے

یہ میری کوئی رائے نہیں، بلکہ میرا تجربہ ہے کہ ان کے اشعار قاری کو اپنی گرفت میں لیکر دیر تک سوچنے پر مجبور کرتے ہیں یہ صورتحال ان کے نت نئے استعاروں یا ان کی اچھوتی تراکیب کی بنا پر ہے کہ اسی میں ان کے ترشے ہوئے ڈکشن کا ہاتھ ہے، یا بیک وقت ان سبھوں کا، اس کے بارے میں آپ خود فیصلہ کریں، پوری کتاب حاضر ہے۔

"شالیمار پبلیکیشنز" نے مالیہ کی کمی کی وجہ اپنے اشاعتی پروگرام کو روک رکھا تھا لیکن ہمیں مسرت ہے کہ اب یہ دشواریاں ختم ہو گئی ہیں جس کا ثبوت ہم "اشعار" آپ کی خدمت میں پیش کر کے دے رہے ہیں . . .

محمود خاور

منظر و پس منظر

میرے خیال میں پائیدار شاعری کبھی محض جوہر ذاتی یا تحصیلِ علم کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ حسّاس طبائع اپنے ماحول اور واقعاتِ زمانہ سے جو تاثرات اخذ کرتے ہیں اور جو تصادم اور کشمکش ایسے افراد اور ان کے خصوصی کلچر کے مابین ہوتی ہے، وہی زندہ رہنے والی شاعری کو جنم دیتی ہے۔

نئے احساسات اور خیالات سماجی حوالوں کے بغیر خالی خالی سے رہتے ہیں، خواہ انھیں ضبطِ نظم میں لانے کے لئے کتنے ہی دل کش استعارات، علامات یا ڈکشن کو آلۂ کار بنایا گیا ہو۔ فکر و فن کے مسائل بھی حیات و کائنات کے مسائل ہی کا ایک حصہ ہیں کیونکہ فکرِ محسوس، جو ادب کا سرچشمہ ہے، اسی دنیا کے تجربات و محرکات سے فیض یاب ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اپنے تہذیبی ورثے اور تخلیقی سرچشمے سے کنارہ کشی

کے متمنی ہوتے ہیں، وہ اعلیٰ ادب سے خصوصی دلچسپی نہیں رکھتے، فطری ذہانت اور علم کی رہنمائی ایسی صورت میں اچھی شاعری سے روابط استوار کرتی ہے جب کہ شاعر کو اپنی زبان کے جینئس اور اپنے شعری روایات کا گہرا احساس بھی ہو اس لیئے کہ عصری صداقتوں کا معنی خیز اظہار انہی واسطوں سے ممکن ہے، جمالیاتی حس بھی عصری تفکرات کے تابع ہے اور تہذیبی تربیت سے بے تعلق نہیں ہے۔

میں اپنی غزلوں میں کہاں تک زندگی کے حرکی عناصر کو سمو سکا ہوں اور اپنے کلچر کے تضاد و تصادم کو پیش کر سکا ہوں۔ اس کا بہتر فیصلہ تو میرے ہم عصر قارئین ہی کر سکتے ہیں۔ میں اپنی طرف سے صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ متواتر تجزیہ و تفتیش کے مراحل سے اس لیئے گذرتا رہتا ہوں کہ پیرایۂ بیاں کو زیادہ سے زیادہ شخصی، انفرادی اور مکمل بنا سکوں۔

میری ذاتی زندگی بے شمار چھوٹے بڑے آلام اور حادثوں کے درمیان گذر گئی ہے، اس کے اثرات میری غزلوں میں آپ کو جا بجا ملیں گے۔ پھر بھی دل نے شکست یا مایوسی کو حرز جاں نہیں بنایا ہے، جہاں کہیں اور جب کبھی مسرت کے لمحات میسر آئے ہیں، میں نے انہیں اپنے رگ و ریشے میں حل کر لینے کی کوشش کی ہے، خواب شکن حالات میں بھی امید سے رشتہ جوڑے رہنا میرے مزاج کا حاوی رجحان ہے ہر آن کوئی تلاش کوئی جستجو مجھے بے چین رکھتی ہے اور خوش آئند تصورات زندہ رہنے کا حوصلہ بخشتے ہیں۔

گرا نفتیم نفسہا بہ جستجوئے مراد ہوائے وادیٔ امید آتش آمیز است

ان غزلوں کو منتخب کرتے وقت یہ بات میرے مدنظر رہی ہے کہ میرے تمام ذیلی اسالیب آپ کے سامنے آجائیں، کئی غزلیں جو ایک ہی انداز اور نہج کی ہیں ان میں سے کوئی ایک غزل چن لی ہے۔ رد و قبول کا یہ عمل ۵۰ء سے ۶۰ء تک کی غزلوں میں زیادہ نمایاں ہے۔ بعض غزلوں کے متعارف اشعار کو بھی میں نے یا تو حذف کر دیا ہے یا انہیں قدرے تبدیل کر دیا ہے، میرے مجموعہ میں میری تمام غزلیں مع حذف شدہ اشعار شامل ہوں گی۔

اب سے پہلے جو میرا کوئی مجموعہ یا انتخاب شائع نہ ہو سکا تھا اس کی بیشتر ذمہ داری مجھ پر ہے، جب بھی کوئی بہانہ ملا میں نے اس کام کو ٹال دیا، ویسے ایک مستقل وجہ ٹال مٹول کی یہ بھی رہی کہ کتاب کی اشاعت سے پہلے اور بعد جن آزمائشوں سے گذرنا پڑتا ہے وہ میرے بس کا روگ نہ تھے، اگر محمود خاور ان ذمہ داریوں کو قبول نہ کرتے تو شاید اس انتخاب کی اشاعت ابھی اور ٹلتی رہتی، میں محمود خاور کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے میری مشکلوں کو حل کیا۔

اس انتخاب کی اشاعت کے وقت وہ تمام احباب یاد آرہے ہیں جو مجھے بار بار اس طرف متوجہ کرتے رہے اور اپنے مشوروں سے نوازتے رہے، جس تپاک اور استقلال سے میری یاددہانی خلیل الرحمن اعظمی، نثار احمد فاروقی، راج نرائن راز، اسد حسین اور اسماعیل آرٹسٹ کرتے رہے اس کے نقوش میرے دل و دماغ پر تازہ ہیں۔

جب میں جدّہ کے کوچہ و بازار یا نیویارک کے مجالس و میکدہ میں خود کو تنہا اور

"بے گھر" سا محسوس کرتا تھا تو مجھے بے اختیار عظیم آباد، علی گڈھ اور دلّی کی بزم آرائیاں یاد آتی تھیں اور پہروں میں گذرے ہوئے لمحات سے چمٹا رہتا تھا، اپنے تہذیبی مراکز سے دور رہ کر کم از کم شاعر و ادیب واقعی غریب الدیار ہو جاتے ہیں، خواہ کتنی ہی مادی آسائشیں انھیں مہیّا ہوں، اس لئے آج مجھے وہ دُور افتادہ رفیقانِ سفر یاد آرہے ہیں جن کی معیت میں کتنے ہی شب و روز گذرے ہیں- ان ہی میں عارف جعفری، احمد جمال صادق، قمر رئیس، ڈاکٹر خورشید الاسلام، ظ- انصاری اور ابوالخیر کشفی ہیں-

میری شاعری کے ابتدائی دور میں فصیح الدین بلخی مرحوم نے مجھے چند فنی اور عروضی نکات سے آگاہ کیا تھا، اس کے بعد سے اب تک کتنے ہی ہم عصروں نے اپنی تنقیدوں سے مجھے مستفید کیا، جن بزرگوں نے شروع ہی سے میری ہمت افزائی کی، ان میں بسمل عظیم آبادی، جمیل مظہری اور معین احسن جذبی کا میں شکر گذار ہوں، جس دردِ آشنائی کے ساتھ احمد یوسف نے میرے اشعار کے تجزیئے کئے اس کے لئے میں ان کا تہہ دل سے ممنون ہوں،

اس کتاب کی اشاعتی داستان نامکمل رہے گی اگر میں ڈاکٹر اسلم پرویز کا شکریہ نہ ادا کروں، جنھوں نے منتخب شدہ غزلوں کو پڑھ کر مجھے کئی مفید مشورے دیئے۔

حسن نعیم

۷ر نومبر ۱۷ء ایوانِ غالب، ماتا سندری لین، نئی دلی-۱

میں غزل کا حرفِ امکاں، مثنوی کا خواب ہوں
دہر کی روداد لکھنے کے لئے بے تاب ہوں

میں ببولوں کی طرح پھولا پھلا ہوں دشت میں
ابر آئے یا نہ آئے میں سدا شاداب ہوں

موجِ صہبا ہوں اگر ہے ظرف یاراں آئینہ
کچھ غبار آئے نظر تو سربسر گرداب ہوں

میں ہوں اک ویراں ستارا گر ہے کوئی ناشناس
کوئی ہے روشن نظر تو چشمۂ مہتاب ہوں

کیا سمجھ کر مجھ سے الجھے ہیں حسنِ لیل و نہار
آپ اپنا روز و شب ہوں، آپ عالم تاب ہوں

ان کے لئے مہتاب ہے، جھیلوں کا سکوں ہے
میرے لئے پابندیٔ آدابِ جنوں ہے

مدت ہوئی غزلوں سے گیا ذکرِ گلستاں
اب حرفِ غزل نوکِ سناں، موجۂ خوں ہے

بجھتا نہیں لاوے کی طرح دل کا دبستاں
جو شعلۂ افکار تھا، اب سوزِ دروں ہے

کچھ راز مکینوں کے ہیں، کچھ راز مکاں کے
اک چھت کے سوا اور بھی کچھ بارِ ستوں ہے

شل ہے نہ کسی وقت حسن جبر کا بازو
یہ سر بھی نگوں تھا نہ کسی آن نگوں ہے

○

ایک بھی حرف نہ تھا خوش خبری کا لکھا
نامۂ وقت ملا اور کسی کا لکھا

آ بسے کتنے نئے لوگ مکانِ جاں میں
بام و در پر ہے مگر نام اسی کا لکھا

موجۂ اشک سے بھیگی نہ کبھی نوکِ قلم
وہ انا تھی کہ کبھی درد نہ جی کا لکھا

کوئی جدّت تو کوئی حسنِ تغزل سمجھا
مرثیہ جب بھی کوئی اپنی صدی کا لکھا

بات شیریں سی لگی فن کے طرف داروں کو
قصّہ ہر چند حسنؔ کوہ کنی کا لکھا

○

ہوائیں رقصاں ہیں دل کے پرزے خرد کے طوفاں کا سلسلہ ہے
جنوں کی بستی اُجڑ چکی ہے، وفا کے شہروں میں زلزلہ ہے

تمام صحرا نواز لوٹے، سبھوں نے کُنجِ چمن بسایا
مگر جو صرصر سے تھی شکایت وہی صبا سے انہیں گلہ ہے

میں جس کو وحشت میں ڈھونڈتا تھا، ہر ایک جنگل ہر ایک قریہ
وہ مصلحت کا لبادہ اوڑھے، صفِ عدو کے قریں ملا ہے

وجود دامن سے کچھ زیادہ، ورودِ گل پر ہوا میں حیراں
ہر ایک کانٹے سے پوچھتا تھا "یہ پھول کس کے لئے کھلا ہے؟"

ہزار سمتوں سے آئے پتھر، مگر جو دل کے مکیں نے پھینکا
اسی کو خلوت میں چومتا ہوں کہ لاکھ سجدوں کا یہ صلہ ہے

جو خواب کو رکھتے تھے گرمِ گردش، میں ان خیالوں کو چھو چکا ہوں
بلا سے آنکھوں سے اشک ٹپکا، بلا سے پاؤں میں آبلہ ہے

نعیمؔ جینے کی آرزو ہے تو آؤ مرنے کا ڈھنگ سیکھیں
یہی دیارِ بتاں کا آئیں، یہی زمانے کا فیصلہ ہے

○

(در مدح قرۃ العین حیدر)

مدح دانش ہو جو اوصاف حمیدہ لکھوں
کوئی تو ایسا ملا جس کا قصیدہ لکھوں

جلوہ فرما ہے جو اوراق کے آئینوں میں
اس کی توصیف میں کیوں حرفِ شنیدہ لکھوں

جس نے ہر لفظ کو موتی سے گراں سمجھا ہو
اس کو کیا شاہ صدف، گوہر دیدہ لکھوں

ایسی گرمی ہے نگارش میں، نوا کی لے میں
جی یہ چاہے ہے اسے شعلہ گزیدہ لکھوں

اس کی تحریر میں خوشبوئے جنوں ہے اتنی
دل معطر ہو اگر میں گل چیدہ لکھوں

جس نے سو ناز اٹھائے ہوں الم کے، اس کو
کیوں نہ اپنی ہی طرح درد کشیدہ لکھوں

مختصر گوئی بھی اک حُسنِ ثنا خوانی ہے
کیا ضروری ہے حسنؔ ایک جریدہ لکھوں

○

دل وہ کشتِ آرزو تھا جس کی پیمائش نہ کی
سیرِ دنیا کے سوا ہم نے کوئی خواہش نہ کی

موتیوں سے چشم و جاں کو آئینہ خانہ کیا
سیپ کے ٹکڑوں سے بام و در کی آرائش نہ کی

کس کو فرصت تھی کہ سنتا اس سفر کا ماجرا
جب اسی منزل نشیں کے ہونٹ نے جنبش نہ کی

اس نے جو بھی روپ دھارا اس نے جو بھی دکھ دیا
آدمی بننے کی ہم نے اس سے فرمائش نہ کی

کچھ قلم بندی سے مجھ کو عار تھا ورنہ نعیمؔ
کب مرے ابرِ نگہ نے فکر کی بارش نہ کی

ہیر کا خواب، پریشانیٔ رانجھا سمجھیں
وہ جو چاہیں تو ہر اک عہد کا قصّہ سمجھیں

جل چکیں دشت نوردی پہ کتابیں گویا
میں کروں ذکر سرابوں کا وہ دریا سمجھیں

یہ ہنر کا بھی ستارا ہے نہایت منحوس
ہم کسے غیر بتائیں، کسے اپنا سمجھیں

اُن کی آنکھوں میں ہے اک حرفِ گذارشِ بے تاب
اک نظر دیکھ لیں سب کو تو اشارا سمجھیں

اشتہار آپ بھی اخبار میں دیتے رہیئے
کیا بُرائی ہے جو نافہم بھی یکتا سمجھیں

مور کا پنکھ لگا کر وہی ناچے بن میں
جن کو تھا شوق کہ سورج کو بھی سایہ سمجھیں

اُن کی باتوں کا خلاصہ یہی نکلا کہ حسن
ہم بھی اب وصل کو ارمان کی دنیا سمجھیں

موسم سیلاب آیا، ندّی نالا بھر گیا
بے وطن سا اک پرندہ اڑ کے واپس گھر گیا

کیسی کالی رات بیتی، کیسا کالا دن چڑھا
جو بگولوں سے لڑا تھا وہ صبا سے ڈر گیا

پے بہ پے، تلوار چلتی ہے یہاں آفات کی
دست و بازو کی خبر لوں تو سمجھیے سر گیا

اب شہیدوں میں رکھو یا اس کو شہیدوں میں گنو
مرنے والا آگ کے دریا سے لڑ کر مر گیا

اس کو آتا ہے وفا کا ڈھنگ طرزِ دلبری
جب جدا مجھ سے ہوا وہ تب گلے مل کر گیا

رند ہونے کے علاوہ دوست ہوگا وہ نعیم
جوڑ کر ٹوٹا پیالہ جو سبو کو بھر گیا

جیسا کہ وہ حسیں مرے حسنِ بیاں میں تھا
اپنے لباسِ خاص نہ جسمِ عیاں میں تھا

وحشت سرائے ذہن میں وہ بھی تھا اجنبی
دل میں رہا مقیم تو اپنے مکاں میں تھا

اڑتے رہے پرند کئی بحر و بر کے بیچ
لیکن کہاں وہ لطف جو اک آشیاں میں تھا

مجھ سے ہوا وہ دور تو کوچہ نورد ہوں
وہ تھا مرے قریب تو میں سائباں میں تھا

شہنائیوں کی گونج نے روکا قدم کو جب
پگڈنڈیوں سے دور رہِ کہکشاں میں تھا

جھیلوں کے آس پاس تھے خیمے سکوت کے
ہنگامۂ حیات تو آبِ رواں میں تھا

مجھ جیسے زود رنج نہ کر پائے خودکشی
کچھ تو وفا کا ڈھنگ بھی جورِ جہاں میں تھا

بس وہ تھا جس کی بات بھلی یا بُری لگی
یہ وصف یہ کمال اسی مہرباں میں تھا

ان انگلیوں نے بڑھ کے اٹھایا قلم نعیمؔ
ہیروں کا ورنہ کان بھی دستِ گماں میں تھا

○

مال و متاعِ دشت سرابوں کو دے دیا
جو کچھ زرِ خیال تھا، خوابوں کو دے دیا

رکھنے کا جو گہر تھا اسے دل میں رکھ لیا
بکنے کا تھا جو مال، کتابوں کو دے دیا

سبزوں کو خوش لباس بنا کر زمین نے
کچھ رشک کا جواز گلابوں کو دے دیا

اپنے لہو کی بوند بنا کر دمِ نشاط
اک سوزِ لازوال شرابوں کو دے دیا

آئے نہ جب گرفت میں سیف و قلم نعیمؔ
اپنا تمام کرب ربابوں کو دے دیا

○

آرام کی تلاش جنوں کا چلن کہاں
صرصر کی طرح میں کبھی کہیں خیمہ زن کہاں

جس دشت کے مزاج سے گنگا تھی آب آب
اس دشت سے نکالتے نہرِ جمن کہاں

چہرہ پہ لکھ چکا ہوں میں خطِّ غبار میں
کھوئی ہے کیسے عمر، گنوایا ہے دھن کہاں

تہذیب قتل گاہ نے اتنا سکھا دیا
مرنا کہاں کمال ہے، جینا ہے فن کہاں

چھوٹا دیارِ یار تو اب فکر ہے نعیم
کس دشت کو بسائیں، بنائیں وطن کہاں

جس جگہ میں نرمیِ اظہار بھی، پتّھر بھی تھا
چاندنی بھی، چشمۂ انوار کا منظر بھی تھا

اُس عمارت میں رہا ہوں مُدّتوں جس کے قریب
رقص[۱] کا بازار بھی، آلام کا دفتر بھی تھا

یار کے قدموں سے لے کر دار کے پہلو تلک
شور جو کچھ دل کے اندر تھا، وہی باہر بھی تھا

فکر کے سبزوں کو روندا پائے دانش نے جہاں
جھاڑیوں میں سر چھپائے وقت کا لشکر بھی تھا

۱۔ بند کمرے میں کھلا اوہام کا دفتر بھی تھا۔ (ظفر اقبال)

کچھ خدا سے ہے شکایت، کچھ فرشتوں سے گلہ
اس سے کیا شکوہ کروں میں، جو کبھی بندر بھی تھا

بھول بھی جاتے اپنے اولیں محبوب کو
داستانِ زندگی کا ہر ورق ازبر بھی تھا

اک تمنّا ہاتھ میں تلوار لے کر جب اٹھی
دل ہی دل میں خواہشوں کو خواہشوں کا ڈر بھی تھا

جس کلی کے قلب میں ہنگامۂ خوشبو تھا بند
کیا خبر تھی سیرِ دنیا کا بپا محشر بھی تھا

دل کہ اب ہے جسم کا بے آب سا گوشہ نعیمؔ
چاند کا آئینہ خانہ، بادلوں کا گھر بھی تھا
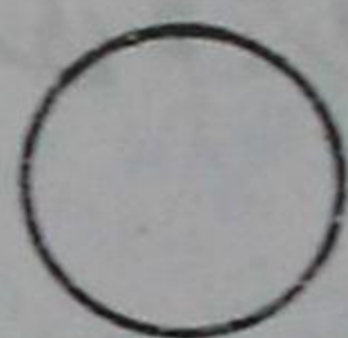
اک خوف اپنی روح میں گرچہ شدید ہے
افکار کے بدن پہ لباسِ امید ہے

اشجارِ سایہ دار کہ ایوانِ آگہی
جو کچھ ہے اپنے پاس جنوں کی خرید ہے

جاری ہے حکم قتل بلا مُہر و دستخط
سر اپنا ہے قلم تو لہو کی رسید ہے

سب سے حسین ملک ہے خوابوں کی سرزمیں
سب سے قدیم شہر دماغِ جدید ہے

ہم ہی نہیں ہیں ایک شہیدِ ادائے دور
مہتاب سا بزرگ بھی اس کا شہید ہے

قبضے میں جس کے لفظ کا فانوس ہے نعیمؔ
تہہ خانۂ خیال کی گویا کلید ہے

○

یہی تو غم ہے وہ شاعر، نہ وہ سیانا تھا
جہاں پہ انگلیاں کٹتی تھیں، سر کٹانا تھا

مجھے بھی ابر کسی کوہ پر گنوا دیتا
میں بچ گیا کہ سمندر کا میں خزانہ تھا

تمام لوگ جو وحشی بنے تھے، عاقل تھے
وہ ایک شخص جو خاموش تھا، دوانہ تھا

مرے لئے نہ یہ مستی نہ آگہی ہے حرام
مجھی کو بزم سے اٹھنا تھا، سر اٹھانا تھا

تمام سبزہ و گل تھے ملازمِ موسم
کلی کا فرض ہی گلشن میں مسکرانا تھا

پتہ چلا یہ ہواؤں کو سر پٹکنے پر
میں ریگِ دشت نہ تھا سنگِ صد زمانہ تھا

وہ میرے حال سے مجھ کو پرکھ رہے تھے حسنؔ
مری نگاہ میں ماضی کا اک فسانہ تھا

شہر یا روقت کا یا عشق کا حملہ ہوا
باوفا لوگوں کا گھر ہر دور میں لوٹا گیا

یہ غنیمت ہے کہ سر ہے زیرِ مہر و ماہتاب
آندھیاں اٹھیں تو خیمہ ناچ گا کر اُڑ گیا

کچھ خطوطِ دست میں تھا کچھ کتابِ نجم میں
جو نہ ہونا تھا وہ اپنے پاس تھا لکھا ہوا

ان کی حسرت بھی وہی تھی جو تھی اپنی آرزو
اتفاقاً ایک دن اس بات کا شبہ ہوا

اس کی اپنی طول عمری کس قدر بے کیف تھی
وہ مرا تو کن دھنوں میں رات بھر باجہ بجا

جب ہوا میں رقص کرتی جا رہی تھی اک پتنگ
جلنے کس کے دل کا ٹکڑا چھت سے گر کر مر گیا

کس طرح قطبین ملتے، مل گئے پھر بھی حسن
حُسن کا ان کو نشہ تھا، عشق کا مجھ کو نشہ

○

ندائے مست سے بھرتے ہیں خالی جام کو اب
کسے مجال کہ لوٹے گدائے شام کو اب

لگا ہوا ہے کئی دن سے وصل کا بازار
کہو یہ ہجر سے آگے بڑھائے کام کو اب

فسردگی بھی قیامت اٹھانے والی ہے
اٹھی ہے خاک کہ چومے فرازِ بام کو اب

سنے گا ہند تو اس سے کہوں گا دردِ وفا
مرے جنوں سے غرض کیا عراق و شام کو اب

عجیب پیار سے اس نے حسنؔ کہا تھا نعیمؔ
میں کس طرح سے بھلاؤں گا اپنے نام کو اب

○

جان کر وجہِ وفا کچھ اور رنجیدہ ہوئے
ملکِ دل کی خاک چھانی تو جہاندیدہ ہوئے

وہ نظر میں تھا تو کج بیں تھے نگہ کے زاویئے
جائزہ اپنا لیا تو اس کے گرویدہ ہوئے

آفتوں کو ہنس کے ٹالا، غم کو جانا اک مذاق
دل نہ مانا تو کبھی دم بھر کو سنجیدہ ہوئے

اُن کا عیبِ خاص جب سے اک ہنر ثابت ہوا
اُن کے جتنے عیب تھے دل کو پسندیدہ ہوئے

سر پہ جو پتھّر لگے تھے ان کی قیمت اور تھی
وہ تراشیدہ ہوئے کہ ناتراشیدہ ہوئے

دی گئی تعلیم دوری جن کو بچپن سے حسنؔ
کیا سمجھ کر آپ ان کے پاس نمدیدہ ہوئے

تھی کہاں بو باس ان کی برگِ صحرا میں نعیمؔ
سائباں ہیں جو کھلے تھے وہ گل چیدہ ہوئے

مری زباں کھلی بھی تو کیا سزا دے گا!؟
بہت ہوا تو مجھے بزم سے اُٹھا دے گا

کھڑا ہوا ہوں مثالِ گیاہ طوفاں میں
کوئی درخت نہیں ہوں کہ وہ گرا دے گا

بلا سے راستہ روکے کھڑا ہے اک مجمع
کوئی تو بھیڑ سے بچنے کا راستہ دے گا

جہاں ہے نعرۂ مستاں، وہیں ہے شہنائی
دبی پکار تو نغمہ ہمیں سلا دے گا

نہ ہو ملول بہت طرزِ خوش جمالاں سے
انہیں میں کوئی وفا کیش دل بڑھا دے گا

نہ دل بجھاؤ، جو شمعِ نوا ہے افسردہ
ہمیں میں کوئی جیالا اسے جلا دے گا

بہت سے باغی و سرکش ہیں قیدیوں میں حسنؔ
کوئی تو جان پہ کھیلے گا، سر کٹا دے گا

○

مری مژہ پہ جو قطرہ دکھائی دیتا ہے
تری پلک پہ ستارہ دکھائی دیتا ہے

اگر اڑان ہو اونچی تو بر اعظم بھی
ہرا بھرا سا جزیرہ دکھائی دیتا ہے

جو ڈوبنا ہو مقدر تو عین ساحل پر
بھنور کی اور کنارا دکھائی دیتا ہے

بجھی یہ آگ نہ دریا نہ ابرِ باراں سے
ازل سے بحر پیاسا دکھائی دیتا ہے

اسے سراب بھی حیراں نہ کر سکا جس کو
دلِ گلاب میں صحرا دکھائی دیتا ہے

یہ شخص جس کو لطیفے ہیں سینکڑوں ازبر
ہنسے تو اور فسردہ دکھائی دیتا ہے

میں اس کی تان سے یوں جذب کا سراپا ہوں
وہ ہر خیال کا نغمہ دکھائی دیتا ہے

وہ میرے شعر کی مانند کج کلاہ سہی
نظر ملاؤ تو اپنا دکھائی دیتا ہے

میں اپنی روح میں اس کو بسا چکا اتنا
اب اس کا حسن بھی پردہ دکھائی دیتا ہے

اسی پہ ختم ہیں یاروں کی محفلیں بھی نعیم
جو دیکھنے میں اکیلا دکھائی دیتا ہے

قصیدہ تجھ سے، غزل تجھ سے، مرثیہ تجھ سے
ہر ایک حرف ہوا صاحبِ نوا تجھ سے

زباں کشائی ٔ غم سے کھلی کتابِ خیال
ورق ورق پہ کھلا برگِ مدعا تجھ سے

زمیں سے پھوٹ پڑا چشمۂ جنوں ساماں
گلوں میں سرد پڑی آتشِ قبا تجھ سے

کہاں سے زود فراموشیوں کی خو سیکھی
جو دیکھیے تو نہ تھی برق آشنا تجھ سے

پہنچ تو جاتا سرِ خیمۂ وفا آباد
مگر ہے سست قدم عمرِ تیز پا تجھ سے

گئے تھے کام جو دل کے سپرد ان کو بھی
دماغِ دہر سے بڑھ کر ہے اب گلہ تجھ سے

ہوا جو کوچۂ تنقید میں حسن رسوا
ملا یا غیب نے غالب کا سلسلہ تجھ سے

دیکھ لوں صورتِ الفاظ تو معنی دیکھوں
آرزو ہے کہ ہر اک درد کا چہرہ دیکھوں

قصبہ و شہر میں ہے آگ کا طوفاں برپا
کون سی شاخ پہ چڑھ کر یہ نظارہ دیکھوں؟

کوچہ ویراں ہے، ستوں سوچ رہا ہے کب سے
کیا دھرا ہے جو مکینوں کا میں رستہ دیکھوں

مثلِ سیّاح کھڑا سوچ رہا ہوں میں بھی
دیکھوں میں حلقۂ زنجیر کہ دنیا دیکھوں

شورِ زنداں میں یہی باعثِ تسکیں ٹھہرا
آنکھ جھپکاؤں تو ممکن ہے کہ سپنا دیکھوں

مجھ کو ہر رنگ میں وہ شخص بھلا لگتا تھا
اس کو نم دیدہ و خاموش کہ ہنستا دیکھوں

اک ندا کوہ کی چوٹی سے بضد ہے کہ حسنؔ
جھاڑ لوں گردِ سفر اُس کا خیمہ دیکھوں

O

یاد کا پھول سرِ شام کھلا تو ہوگا
جسم مانوس سی خوشبو میں بسا تو ہوگا

قطرۂ مے سے دبا رات نہ طوفانِ طلب
مجھ پہ جو بیت گئی رات سُنا تو ہوگا

کوئی موسم ہو یہی سوچ کے جی لیتے ہیں
اک نہ اک روز شجر غم کا ہرا تو ہوگا

یہ بھی تسلیم کہ تو مجھ سے بچھڑ کے خوش ہے
تیرے آنچل کا کوئی تار ہنسا تو ہوگا

وہ نہ مانوس ہوں کچھ خاص علائم سے حسنؔ
ایک قصہ مری آنکھوں نے کہا تو ہوگا

○
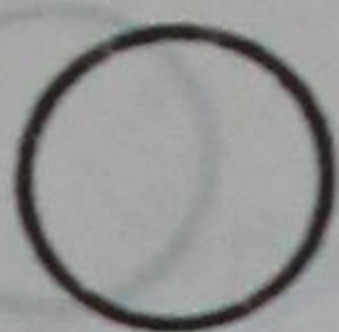
ہاتھ پھیلایا نہ منعم کا نوالہ توڑا
میں ہوں وہ جس نے خموشی کا پیالہ توڑا

آج آتش کدۂ غم سے ملا اک گُل داں
ہم نے لب سے ترے وہ پھول نرالا توڑا

وار کرنے کے لئے لائے تھے کیا کچھ احباب
روک لی دل پہ سناں، فرق سے بھالا توڑا

عمر جب بیت گئی دشت نوازی میں حسن
ان کی پلکوں نے مرے پاؤں کا چھالا توڑا

باغ کو باغ کیا خوشۂ محنت سے نعیم
دست گل کھینچا، نہ پیمانۂ لالہ توڑا

دل میں ہو آس تو ہر کام سنبھل سکتا ہے
ہر اندھیرے میں دیا خواب کا جل سکتا ہے

عشق وہ آگ جو برسوں میں سلگتی ہے کبھی
دل وہ پتھر جو کسی آن پگھل سکتا ہے

ہر نر اشا ہے لئے ہاتھ میں آشا بندھن
کون جنجال سے جیون کے نکل سکتا ہے

جس نے ساجن کے لئے اپنے نگر کو چھوڑا
سر اٹھا کر وہ کسی شہر میں چل سکتا ہے

میرا محبوب ہے وہ شخص جو چاہے تو نعیمؔ
سوکھی ڈالی کو بھی گلشن میں بدل سکتا ہے

○

پتہ نہیں کہ وہ چہرے کا رنگ تھا کیا تھا
لہو نچوڑ کے جینے کا ڈھنگ تھا کیا تھا

نکل پڑی ہے مری روح کیوں برہنہ پا
لباسِ عشق بہت دل پہ تنگ تھا کیا تھا

خبر نہیں کہ انہوں نے کہاں پہ سر پھوڑا
خرد کے طرۂ نعلیں میں سنگ تھا کیا تھا

پڑی ہے خاک پہ اک لاش تو چلو دیکھیں
یہ اپنے دیش کا باسی ملنگ تھا کیا تھا

نعیمؔ کتنے چمن اور کھل اٹھے دل میں
وصالِ یار ہی خوشبو تھا، رنگ تھا کیا تھا

صحرا لہک اُٹھے گا، دریا چلے جدھر سے
جس دیس کی گھٹا ہے، اُس دیس پر تو برسے

مکتوبِ یار ہوتا تو حرف حرف پڑھتے
تحریرِ وقت پڑھ لی، ہم نے اِدھر اُدھر سے

کیا مجھ میں دیکھتی ہے وقتِ وداع و آمد
پوچھوں تو بوسہ لے کر اس چشمِ باخبر سے!

جیسے ہی شام آئی، جوڑا بطوں کا اُترا
جس پیڑ کے تلے تھا، اک شخص دوپہر سے

شرطِ وفا نبھائی اک دور کے سفر کی
ویراں سی خواب گہہ میں مانا بدن کو تر سے

مجبوریاں بہت تھیں دستِ وفا طلب کی
دامن پکڑ کے ان کا چھوڑا ہے اپنے ڈر سے

ہم کو نعیم اس کی اب فکر ہی نہیں ہے
کوئی بٹھائے سر پر، کوئی اٹھائے در سے

جو غم کے شعلوں سے بجھ گئے تھے، ہم ان کے داغوں کا ہار لائے
کسی کے گھر سے دیا اُٹھایا، کسی کے دامن کا تار لائے

یہ کوہساروں کی تربیت ہے کہ اپنا خیمہ جما ہوا ہے
ہزار طوفاں سناں چلائے، ہزار موجِ غبار لائے

کسے بتائیں کہ غم کے صحرا کو خلدِ دانش بنایا کیسے؟
کہاں سے آبِ رواں کو موڑا، کہاں سے بادِ بہار لائے

ہر ایک راہِ جنوں سے گزرے، ہر ایک منزل سے کچھ اٹھایا
کہیں سے دامن میں غم سمیٹا، کہیں سے جھولی میں پیار لائے

خلا کے ماتھے پہ ایک بندی، نہ جانے کب سے چمک رہی تھی
اسے بھی اپنی زمیں کی خاطر، ہوا میں اڑ کر اُتار لائے

جو اپنی دنیا بسا چکا ہے، اُسے بھی مشکل کا سامنا ہے
کہاں سے شمس و قمر اُگائے، کہاں سے لیل و نہار لائے

وہی شباہت، وہی ادائیں، مگر وہ لگتا ہے غیر جیسا
نعیمؔ یادوں کی انجمن میں نہ جانے کس کو پکار لائے

○

"تم کو جانا ہو زمیں تک تو کہو کچھ لب سے"
یوسف روز نے فرمایا نگارِ شب سے

تم کہ ہو یاس کی وادی میں جھکائے ہوئے سر
ہم کہ امید کی سرحد پہ کھڑے ہیں کب سے

کتنی یادوں کو کیا قیدِ مکاں سے آزاد
کتنی یادوں کو ہوں جکڑے ہوئے تارِ شب سے

ابر و باراں کی دعا دشت نے جب سے مانگی
ہے سرابوں کو پریشانیٔ خاطر تب سے

دی اذاں اس نے بہت اپنے مناروں سے حسن
کچھ ہمیں دور رہے حسن کے تاب و تب سے

○

خورشید کی نگاہ سے شبنم کو آس کیا
تصویرِ روزگار سے دل ہوا داس کیا

شہرت کی گرد، خواب کے طوفاں، غموں کی دھول
ان کے سوا ہے اور زمانے کے پاس کیا

ٹوٹا نہ زورِ غم، نہ زمانے کا سر جھکا
نکلے گی وصلِ یار سے دل کی بھڑاس کیا

ہم کو کتابِ زیست کا ہر باب حفظ ہے
اک بابِ غم کا صرف پڑھیں اقتباس کیا

نکلے ہیں زہرِ کرب میں بجھ کر تمام لفظ
گھولیں سبوئے شعر میں غم کی مٹھاس کیا

جن کی نظر میں ہیچ ہے تاجِ ہنر نعیمؔ
ان کے حضور میں کیا، مری التماس کیا

جنوں سے قیمتِ حسنِ طلب وصول کرو
مرا سلام، مری بندگی قبول کرو

مرے لہو میں ہیں خوابیدہ ابر و باد حیات
مجھے نہ پاس کے طوفانو! یوں ملول کرو

میں در کے پاس کھڑا ہوں نکل چلو اس رات
تم اپنے خواب سے بچنے کی اب نہ بھول کرو

جمالِ یار کو یادوں میں یوں کرو تحلیل
ہنسی کو موجِ صبوحی، لبوں کو پھول کرو

وفا کے سارے قواعد بتا رہے ہو جسے
بیان اس سے محبت کے بھی اصول کرو

کبھی تو سر سے اتارو خمارِ خوش طلبی
دراز دست بنو، خواہشِ فضول کرو

روش روش پہ اٹھاؤ گلوں کے ناز نعیمؔ
میانِ دشت مگر خدمتِ ببول کرو

ڈھونڈو تو صرف آنچ ہے، شعلہ کہیں نہیں
جلتا ہے دل کہ غم کا سراپا کہیں نہیں

آنکھوں کی خاک دھول کو شبنم سے دھوئیے
جو تھا نگارِ دشت وہ چشمہ کہیں نہیں

تفصیلِ غم تو درج ہے لوحِ حیات پر
خود زندگی کا کوئی خلاصہ کہیں نہیں

کہتے تھے کچھ رفیق جو آئے ہیں لوٹ کے
وہ تختۂ گلاب و خیمہ کہیں نہیں

اس گھر میں سب مُرید اُسی مہرباں کے ہیں
جس پیکرِ جمال کا جلوہ کہیں نہیں

سامانِ صد چمن تھا اٹھائے ہوئے نعیمؔ
وہ کاروانِ ابر جو اُترا کہیں نہیں

نہ میرے خواب کو پیکر، نہ خدو خال دیا
بہت دیا تو مجھے موقعٔ وصال دیا

ملا نہ روح نہ دل کا کوئی حساب مگر
یہ کارِ زیست کسی طور سے سنبھال دیا

تمام عمر کی بے چینیوں کا اجر تھا یہ
مرے جنوں کو خرد کہہ کے اُس نے ٹال دیا

کسی نگاہ نے امید کو دیا چہرہ
کسی شبیہ نے سب سے حسیں خیال دیا

مرے عیوب کی تصویر اس طرح کھینچی
مرے ہنر کو پسِ پشت اُس نے ڈال دیا

کئی خیال جو آوارہ خو تھے، سرکش تھے
اُنھیں بھی شعر کے سانچے میں ہم نے ڈھال دیا

اُسی نے سر پہ بٹھایا تھا جس نے آج نعیمؔ
سمجھ کے پاؤں کا کانٹا، مجھے نکال دیا

میں کس ورق کو چھپاؤں، دکھاؤں کون سا باب
کسی حبیب نے مانگی ہے زندگی کی کتاب

اُنھیں سے شب میں اُجالا، اُنھیں سے نورِ خیال
مرے لئے تو بہت کچھ ہیں دیدۂ بے خواب

ہمیں نہ بھولنا آلامِ صد زماں کہ یہاں
ہمیں ہیں مسکنِ حرماں، ہمیں ہیں بیتِ عذاب

گیا تھا دشت سے اُٹھ کر سمندروں کی طرف
وہاں بھی تشنہ نصیبی، وہاں بھی مرگِ سراب

پکڑ کے دامنِ دل' یا جھکا کے سر اپنا
دیا ہے خوابِ شکستہ کا ہر کسی کو حساب

وہ آنکھیں پیار کے لہجے میں کہہ رہی تھیں حسنؔ
ہمیں سے مانگ پیالہ، ہمیں سے مانگ شراب

ہوا بہار کے موسم میں یوں چلی کہ نعیمؔ
نہ سرخ رو تھا گلستاں، نہ سرخ رُو تھے گلاب

چہرے پہ مہرِ غم ہے، خط و خال کی طرح
ماضی بھی دم کے ساتھ ہے اب حال کی طرح

پتّے تھے خاک بوس تو شاخیں تھیں سرنگوں
کنجِ چمن بھی تھا، دلِ پامال کی طرح

تہذیب ہے کہ آئے تو ہنس بول کر گئے
چپکے سے جایئے نہ مہ و سال کی طرح

اپنے حروفِ شوق جو شعلہ بجاں تھے کل
ٹھنڈے پڑے ہیں آج وہ اقوال کی طرح

سب کے ستارے دیکھ کے دل نے صلاح دی
گردش میں کیوں پڑو کسی رمّال کی طرح

آنچل میں نیند باندھ کے اے رات آ بھی جا
یہ دن لگا ہے جان کو جنجال کی طرح

رکھیے بچا کے اپنا دفینہ حسن نعیم
غم کو لٹائیے نہ زر و مال کی طرح

پو پھٹی تھی کہ شبِ وصل کا پیغام ملا
سو گئے خواب کی باہوں میں جو آرام ملا

ڈھونڈتے رہے شب و روز امیدوں کے قدم
کوچۂ زیست میں لے دے کے یہی کام ملا

خوبیٔ بخت کہ جب بھول چکا تھا سب کچھ
بے وفائی کا لبِ غیر سے الزام ملا

پا پیادہ تھا مگر راہ میں وہ دھوم مچی
جھک کے تعظیم سے شہزادۂ ایّام ملا

ہم نے بیچی نہیں جب روز متاعِ غیرت
اک پیالہ بھی نہ مے کا ہمیں اُس شام ملا

مختصر یہ ہے کہ جب وقتِ وداعِ گل تھا
خواب میں آ کے گلے مجھ سے وہ گلفام ملا

ہم جنوں، ہے کہ نہیں راہ میں پوچھیں گے نعیمؔ
دشتِ غربت میں یہ کیا کم ہے کہ ہم نام ملا

○

سارے جہاں کی سیر کا امکان مل گیا
بوئے چمن کو راہ میں طوفان مل گیا

سوزِ وفا کو حسن کا پیغام کیا ملا
اک غم زدہ کو میرؔ کا دیوان مل گیا

مشکل پسندیوں سے طبیعت جو خوش ہوئی
دشواریوں کو حیلۂ آسان مل گیا

مغرب ہے وہ دیار کہ بوس و کنار کیا
مٹی میں یاں وصال کا ارمان مل گیا

یادیں تھیں محوِ خواب، تو نغمے تھے گُم نغیم
کشفیؔ ملے تو شعر کا سامان مل گیا

کوئے رسوائی سے اُٹھ کر دار تک تنہا گیا
مجھ سے جیتے جی نہ دامن خواب کا چھوڑا گیا

کیا بساطِ خار و خس تھی، پھر بھی یوں شب بھر جلے
دوش پر بادِ سحر کے دُور تک شعلہ گیا

رُوح کا لمبا سفر ہے ایک بھی انساں کا قرب
میں چلا برسوں تو ان تک جسم کا سایہ گیا

کس کو بے گردِ مسافت شوق کی منزل ملی
نغمہ گر کی خلوتوں تک بارہا نغمہ گیا

کون مجھ کو ڈھونڈتا تھا، کچھ پتا چلتا نہیں
بزمِ خوباں میں ہزاروں بار میں آیا گیا

ہم وہ شاعر کہ سناتے ہیں سرودِ جاں حسن
ایک بھی شعلہ نفس محفل میں گر دیکھا گیا

مل گئے جب نرم آدیشور دشتِ غربت میں نعیم
اک نیا رشتہ عظیم آباد سے جوڑا گیا

○

کتابِ علم ہے قطرہ بھی، بحر کی مانند
فسانہ دہر کا تشنہ ہے، دہر کی مانند

ترا خیال جو میٹھا سا درد تھا پہلے
اُتر گیا ہے رگ و پے میں زہر کی مانند

یہ دل کہ قصبۂ گم نام سے مشابہ تھا
ترے قدم سے ہے معروف شہر کی مانند

ہر ایک سمت سے گھیرا تھا تیرہ بختی نے
بچا لیا ترے گیسو نے سحر کی مانند

مجھے خبر ہے مرا منتظر ہے کون نعیم
رواں ہوں سوئے سمندر میں نہر کی مانند

ایک داغِ مستقل ہے قربِ یاراں کا صلہ
چاند کو اس کے علاوہ آسماں سے کیا ملا

عجز ہے سازِ نظر کا ورنہ شب کے دو بدو
دور تک پھیلا ہوا ہے روشنی کا سلسلہ

غم کی اپنی منطقیں، خوشیوں کے اپنے فلسفے
دل نے رکھا پھر بھی خوابِ نو بہ نو کا حوصلہ

اب تو آ جاؤ کہ ہم نے کاٹ لی قیدِ انا
انتظارِ روشنی میں اپنا دیدہ بہہ چلا

کس طرح اب باندھیے گا عشق کے مضموں نعیمؔ
یاں وصالِ یار بھی ہے اقتصادی مسئلہ

○

خواب کی راہ میں آئے نہ در و بام کبھی
اس مسافر نے اٹھایا نہیں آرام کبھی

رشکِ مہتاب ہے اک داغِ تمنا کب سے
دل کا نظارہ کرو آکے سرِ شام کبھی

شب بخیر اس نے کہا تھا کہ ستارے لرزے
ہم نہ بھولیں گے جدائی کا وہ ہنگام کبھی

سرکشی اپنی ہوئی کم، نہ اُمیدیں ٹوٹیں
مجھ سے کچھ خوش نہ گیا موسمِ آلام کبھی

ہم سے آواروں کی صحبت میں ہے وہ لطف کہ بس
دو گھڑی مل تو سہی، گردشِ ایّام کبھی

اے صبا میں بھی تھا آشفتہ سروں میں یکتا
پوچھنا دلّی کی گلیوں سے مرا نام کبھی

جب کبھی میرے قدم سوئے چمن آئے ہیں
اپنا دکھ درد لئے سرو و سمن آئے ہیں

پاؤں سے لگ کے کھڑی ہے یہ غریب الوطنی
اس کو سمجھاؤ کہ ہم اپنے وطن آئے ہیں

جھاڑ لو گردِ مسرت کو، بٹھا لو دل میں
بھولے بھٹکے ہوئے کچھ رنج و محن آئے ہیں

جب لہو روئے ہیں برسوں تو کُھلی زلفِ خیال
یوں نہ اس ناگ کو لہرانے کے فن آئے ہیں

کچھ عجب رنگ ہے اس آن طبیعت کا نعیم
کچھ عجب طرز کے اس وقت سخن آئے ہیں

(بہ یادِ پرویز شاہدی)

یہی وجہِ الم ٹھہری، محبت کے فسانے میں
وہ ہشیاروں کی خو ڈھونڈا کیے بانکے دِوانے میں

وہ بزمِ فکر و فن ہو، یا ستم رانوں کا مجلس ہو
عجب اک شان آنے میں، عجب اک شان جانے میں

فقیہہ شہر کا ڈر تھا، نہ ڈر تھا شہر یاروں کا
جو شعلہ دل میں رقصاں[1] تھا، وہی تھا ہر ترانے میں

زہے قسمت عظیم آباد نے جوہر[2] شناسی کی
اڑی ہے خاک جب پرویز کی ویران خانے میں

نگاہیں دیکھ لیتی ہیں جہاں ہیں درد کے چشمے
وہ چہرہ ڈوب جاتا ہے نعیم[3] آنسو بہانے میں

---

[1] مجموعۂ کلام "رقصِ حیات" دوسرا مجموعہ انتقال کے بعد "تثلیثِ حیات" کے نام سے

[2] مرے جوہر نے رسوا کر دیا مجھ کو زمانے میں ٭ وہ جلوہ ہوں جو ٹکراتا پھرا آئینہ
(پرویز شاہدی)

گیا وہ خواب، حقیقت کو روبرو کر کے
بہت اداس ہوں میں اُن سے گفتگو کر کے

انہی میں ایک نے مجلس میں سرفراز کیا!
ملے ہیں داغ کئی ان کی آرزو کر کے

کرو نہ دفن کہ مقتل کا نام اونچا ہو
لٹا دو خاک پہ لاشے کو قبلہ رو کر کے

اُٹھو نعیمؔ کہ باغِ عدم سے ہو آئیں
وہیں گئے ہیں تپشؔ دل کو یوں لہو کر کے

لہ سب سے بڑے بھائی سید احمد تپشؔ

کوہ کے سینے سے آبِ آتشیں لاتا کوئی
اس نوائے آگہی کو ڈوب کر گاتا کوئی

دیکھنا مستی کا سنگم، لب ہے یا گفتار ہے
جام سے میرے جو اپنا جام ٹکراتا کوئی

بادلوں کی طرح آیا، برق آسا چل دیا
چاند کی مانند شب بھر تو ٹھہر جاتا کوئی

حسن کا دل سے تعلق دائمی ہے، گرم ہے
ورنہ کس کا کس سے ہے رشتہ کوئی، ناتا کوئی

سازِ شعلہ پر سناتا گیت پورب دیس کے
اتنی بے مہری ہے برسوں آگ برساتا کوئی

مانگنے کو مانگ لیں اشعارِ غم سے دل کشی
مل نہیں سکتا ہے ان کو فکر سا داتا کوئی

نازشِ فردا مرا اوجِ تغزل ہے نعیمؔ
رنج ہوتا آج گر کچھ قدر فرماتا کوئی

وہ کج نگاہ نہ وہ کج شعار ہے تنہا
بس اک پیمبرِ جنّت نثار ہے تنہا

نہ بلبلوں کی اذاں ہے نہ تتلیوں کا طواف
ابھی چمن میں گلِ نو بہار ہے تنہا

اُٹھائے منّتِ صرصر کہ نازِ بادِ نسیم
ہر ایک حال میں صحرا اشکار ہے تنہا

فلک نجوم سے روشن، زمیں چراغوں سے
ہجومِ نور میں اک شامِ تار ہے تنہا

جمی ہے بزمِ مسرت غزال چشموں سے
ملی ہے جس کو نظر اشکبار ہے تنہا

ہمیں نے خیمۂ ہجراں میں کاٹ دیں راتیں
ہمیں کو فکر تھی بے حد کہ یار ہے تنہا

چہل پہل ہے بہت یوں تو میکدے میں نعیمؔ
میانِ جام و سبو بادہ خوار ہے تنہا

بیانِ شوق بنا، حرفِ اضطراب بنا
وہ اک سوال کہ جس کا نہ کچھ جواب بنا

میں ایک باب تھا افسانۂ وفا کا مگر
تمھاری بزم سے اٹھا تو اک کتاب بنا

مجھے سفیر بنا اپنا کو بہ کو اے عشق
کسے ہوس ہے کہ دنیا میں کامیاب بنا

میں جس خیال کو اپنا جنوں سمجھتا تھا
وہی خیال زمانے کا حُسنِ خواب بنا

کبھی تو وجہِ کرم بن گئی ہے خودداری
کبھی نیازِ طلب باعثِ عتاب بنا

سرائے دل میں جگہ دے تو کاٹ لوں یہ رات
نہیں یہ شرط کہ مجھ کو شریکِ خواب بنا

اسیرِ چرخ کا احساں نہیں ہے مجھ پہ نعیم
مجھے ہے ناز کہ ذرّہ سے آفتاب بنا

دل میں اترو گے تو اک جوئے وفا پاؤ گے
موجِ در موجِ سمندر کا پتا پاؤ گے

میں تو کھو جاؤں گا تنہائی کے جنگل میں کہیں
تم بھرے گھر میں کہاں مجھ کو بھلا پاؤ گے

دل سے بے ساختہ اٹھے ہیں، بڑھاؤ کفِ دست
آج آنسو کو بھی ہم رنگِ حنا پاؤ گے

آگ ہی آگ سہی خواب میں جل کر دیکھو
اس جہنم میں بھی جنت کی ہوا پاؤ گے

غم اٹھانے کا یہ انداز بتاتا ہے نعیمؔ
اک نہ اک روز وفاؤں کا صلہ پاؤ گے

○

پیکرِ ناز پہ جب موجِ حیا چلتی تھی
قریۂ جاں میں محبت کی ہوا چلتی تھی

اُن کے کوچے سے گذرتا تھا اٹھائے ہوئے سر
جذبۂ عشق کے ہمراہ انا چلتی تھی

اک زمانہ بھی چلا ساتھ تو آگے آگے
گرد اُڑاتی ہوئی اک موجِ بلا چلتی تھی

پردۂ فکر پہ ہر آن چمکتے تھے نجوم
فرش تا عرش کوئی ماہ لقا چلتی تھی

دل کو اب بھی ہے یہی وہم کہ مجھ سے چھپ کر
پیچھے پیچھے مرے وہ جانِ وفا چلتی تھی

دل میں جو یاد رہا کرتی ہے غم کی صورت
کل وہی یاد بہ اندازِ ندا چلتی تھی

میں ہی تنہا نہ خرابوں سے گذرتا تھا نعیم
شام تا صبح ستاروں کی ضیا چلتی تھی

○

ہر پھول مضمحل ہے، ہر اک پتہ زرد ہے
جو شاخ گر گئی ہے وہ تصویرِ درد ہے

جوئے رواں کے پاس ہے سویا ہوا کوئی
جھولی میں زادِ راہ نہ منزل کی گرد ہے

حیراں ہے برگِ سبز جو سائے میں اس کے آج
گم صم کھڑا ہوا کوئی صحرا نورد ہے

ہر نامرادِ شوق ہے یکتائے روزگار
ہر غم شناس، علمِ زمانہ میں فرد ہے

کیا غم کریں کہ عشق میں چھوڑا نہ سر کبھی
پہلے تو خوں ہی سرد تھا اب دل بھی سرد ہے

قاتل کے انتظار میں کیوں بیڑیاں گنے
زنجیر ہی سے وار کرے وہ جو مرد ہے

ہر شخص دام پوچھ کے آگے بڑھا نعیمؔ
جنسِ ہنر کا آج بھی بازار سرد ہے

○

دامن کو اپنے چاک کرو یا رفو کرو
خوابوں سے دل لگاؤ، کوئی آرزو کرو

شاید کہ مثلِ مہر کوئی آئے صبح دم!
شامِ فراق تم بھی جگر کو لہو کرو

آئے گی کس کے کام یہ رعنائیٔ خیال
نغمو! دیارِ فکر میں رہنے کی خو کرو

کب تک تلاشِ حسن میں بھٹکو گے دشت دشت
جو ذرہ سامنے ہو اسے لالہ رو کرو

کنجِ محن سے آؤ سوئے میکدہ نعیمؔ
احسن ہے کارِ غم سے کہ شغلِ سبو کرو

○

وحشتِ جاں کو پیامِ نگہ ناز تو دو
اس فسانے کو ذرا گرمیٔ آغاز تو دو

میرے قدموں کے نشاں راہ سے کچھ دور سہی
تم سے میں دور نہیں ہوں، مجھے آواز تو دو

دل میں طوفاں نہیں ہو تو کرے کیا نغمہ
میں سناتا ہوں یہی راگ مجھے ساز تو دو

کوئی بنیاد نہیں قیدِ تعلق کی ابھی
جذبۂ غم کو ذرا فکر کا انداز تو دو

اس نے سینے سے لگایا جو کہا میں نے حسنؔ
دل میں رکھنے کیلئے اپنا کوئی راز تو دو

وہ بھی کہتا تھا کہ اس غم کا مداوا ہی نہیں
دل جلانے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں

زورِ وحشت بھی اگر کم ہو تو چلتا ہے مدام
سر چھپانے کے لئے دشت میں سایہ ہی نہیں

جل کے ہم راکھ ہوئے ہیں کہ بنے ہیں کندن
جوہری بن کے کسی شخص نے پرکھا ہی نہیں

گردِ شہرت کو بھی دامن سے لپٹنے نہ دیا
کوئی احسان زمانے کا اُٹھایا ہی نہیں

میری آنکھوں میں وہی شوقِ تماشا تھا نعیم
اُس نے جھک کر مری تصویر کو دیکھا ہی نہیں

○

جب تک شعورِ عشق ہے، پاسِ جمال ہے
زندانِ آرزو سے نکلنا محال ہے

ہر لمحہ اضطراب ہے، ہر لحظہ انتشار
دل کا وہی ہے حال، جو دنیا کا حال ہے

گذرا جو کوئے یار سے، اس نے صدا نہ دی
دل ہے کہ اتنی بات سے ناحق نڈھال ہے

جو بھی صلہ ہو تجھ سے محبت کا اے حیات
ہر شخص اپنے آپ وفا کی مثال ہے

سنتے ہیں اے نعیمؔ سوائے کمالِ فن
دنیا میں ہر عروج پہ اک دن زوال ہے

عشق سے اپنی نبھی ہو کہ زمانے سے چھنی
تم نے پوچھا نہیں افسوس کہ کیا ہم پہ بنی

ان کے کوچے میں بسا میں کہ پھرا شہر بہ شہر
در بہ در ساتھ پھرا دردِ غریب الوطنی

جرأتِ شوق کا شاہد ترا پیمانِ وفا
جرأتِ فکر کی مظہر تری پیماں شکنی

جب ملی دولتِ نایاب تمہارے غم کی
کشت و صحرا بھی ہوئے نقشِ کفِ پا سے غنی

کوئی تنہا نہیں دنیا میں بجز دردِ وفا
اس کے ہمدم ترے آنسو، نہ مری کوہ کنی

کتنے افکار کا زینہ ہے تری زلفِ دراز
کتنے خوابوں کا چمن ہے تری گل پیرہنی

عندلیبوں کی نوا بخششِ گل ہے تو نعیم
ہم بھی سیکھیں گے لبِ یار سے شیریں سخنی

۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء کی غزلوں کا انتخاب

وہی طالبِ ضیا ہو جو اٹھائے نازِ ظلمت
وہی بوسۂ سحر لے جو سنوارے شامِ غم بھی

خیر سے دل کو تری یاد سے کچھ کام تو ہے
وصل کی شب نہ سہی، ہجر کا ہنگام تو ہے

نورِ افلاک سے روشن ہو شبِ غم کہ نہ ہو
چاند تاروں سے مرا نامہ و پیغام تو ہے

کم نہیں اے دلِ بے تاب متاعِ اُمید
دستِ میخوار میں خالی ہی سہی، جام تو ہے

بامِ خورشید سے اُترے کہ نہ اُترے کوئی صبح
خیمۂ شب میں بہت دیر سے کُہرام تو ہے

جو بھی الزام مرے عشق پہ آیا ہو نعیم
اُن سے وابستہ کسی طور مرا نام تو ہے

صبحِ طرب تو مست و غزل خواں گذر گئی
شامِ الم جو آئی، تو آ کر ٹھہر گئی

دیکھا کسی نے اوجِ تصوّر، نہ اوجِ فن
پنہاں تھا ایک عیب تو سب کی نظر گئی

یادِ خدا سے بابِ حرم تک کھُلا نہیں
یادِ بتاں سے دل پہ قیامت گذر گئی

تڑپا قفس میں کون جو اے صبحِ نو بہار
روئے گل و گیاہ، صبا چشمِ تر گئی

اتنا دلِ نعیم کو ویراں نہ کر مجاز
روئے گی موجِ گنگ جو اس تک خبر گئی

شامِ الم کو یاد رکھ، صبحِ طرب کے بعد بھی
سوزِ جنوں سے کام لے منزلِ شب کے بعد بھی

دل میں نہ جانے کیا رہا مثلِ شرارِ جستجو
جوششِ طلب کے وقت بھی ترکِ طلب کے بعد بھی

تجھ کو بتائیں کیا صبا، ہم نے جلایا کیوں چراغ
آمدِ خور کے باوجود، رخصتِ شب کے بعد بھی

شکر کرو ، مل گیا ، خواہ سبھوں کے بعد ہو
ملتا ہے ورنہ کس کو جام ، حسنِ طلب کے بعد بھی

سر میں اگر جنوں نہ ہو ، ملتا نہیں ہے تاجِ فن
فکر و نظر کے باوجود ، نام و نسب کے بعد بھی

دیکھیں نہ مجھ کو اہلِ بزم ، ایسی نظر سے اے نعیم
آیا ہوں میں تو بارہا ، بزم میں سب کے بعد بھی

○

دلوں میں آگ لگاؤ تو آکشی ہی کرو
نہیں ہے شغلِ جنوں کچھ تو شاعری ہی کرو

یہ کیا کہ بیٹھ رہے جا کے خلوتِ غم میں
نہیں ہے کچھ تو چلو، چل کے میکشی ہی کرو

یہی ہنر کا صلہ ہے تو ناقدانِ سخن
کسی اصول کے پردے میں دشمنی ہی کرو

صدائے دل نہ سنو، عرضِ حال تو سن لو
کہاں یہ فرض ہے تم پر کہ منصفی ہی کرو

یہی نعیمؔ بہت ہے جو کاٹ لو یہ رات
یہ کچھ ضرور نہیں ہے کہ روشنی ہی کرو

بدلیں جو ہوائیں گلشن کی، ہر کنج و روش تھی ویراں ویراں
اک آن میں جزو خاک ہوئے، وہ گل جو کھلے تھے خنداں خنداں

اے عشق یہی تو رونا ہے، اک دورِ جنوں برباد گیا
کیوں آتشِ گل کی فصل میں ہم کوچے میں کھڑے تھے ناداں ناداں

ہم کس کو بتائیں کیا کیا ہے، بے تابیٔ جاں کو ان سے گلہ
ہم کس کو دکھائیں جا جا کر، کیوں چشمِ وفا ہے گریاں گریاں

وہ کب کے یہاں سے جا بھی چکے، وہ کب کے غزالِ شہر ہوئے
تم کس کو نعیم اب ڈھونڈ رہے ہو، وادی و صحرا حیراں حیراں

سوئے مقتل نہ گئے ، عازمِ صحرا نہ ہوئے
کیا ہوئے ہم جو تری راہ میں رسوا نہ ہوئے

کتنے سازوں نے سنا ہی نہیں موسیقیِ دل
کتنے آہنگ تھے جو شاملِ نغمہ نہ ہوئے

کچھ خبر ہے تجھے اے ناقدِ چشمِ گریاں
کتنے طوفان ہیں سینے میں جو برپا نہ ہوئے

عشق میں ہٹ کے بھی اک آن سلامت رکھی
خاکِ داماں تو بنے ، گردِ کفِ پا نہ ہوئے

وہ زمانے کا بدلتے رہے کردار نعیمؔ
جن کے کردار زمانے کو گوارا نہ ہوئے

کوئی وجہ غم نہیں ہے، کسی بات کا ہے غم بھی
اسی دردِ گم شدہ سے کبھی رو دیئے ہیں ہم بھی

وہی طالبِ ضیا ہو، جو اٹھائے نازِ ظلمت
وہی بوسۂ سحر لے جو سنوار دے شامِ غم بھی

مرے کھوئے کھوئے رہنے کی ہر ایک سے شکایت
یہی آپ کا تغافل، یہی آپ کا کرم بھی

کریں ضبطِ غم کہاں تک، رہیں دل فگار کب تک
کوئی غم گسار آئے تو لپٹ کے روئیں ہم بھی

اُٹھو اے نعیم گائیں شبِ ہجر کا ترانہ
کسی کام آئے آخر یہ فضائے پُر الم بھی

○

کوئی تھا ناصح تو کوئی ہم نشین و رازداں
کون دشتِ غم میں ہو گا اب رفیقِ عاشقاں

دشت پیمائی ہے اپنی، عہدِ حاضر کا جنوں
بن چکے ہیں مجھ سے پہلے میرے قدموں کے نشاں

خلوتِ امید میں روشن ہے اب تک وہ چراغ
جس سے اٹھتا ہے قریبِ شام یادوں کا دھواں

ذہن کو رکھنا ہے روشن اس اندھیری رات میں
حافظے میں قید رہنا، اے ضیائے رفتگاں

گوش بر آواز ہے محفل کی محفل اے نعیم
آ گیا شاید کوئی شعلہ نوا، جادو بیاں

لطفِ آغاز ملا لذّتِ انجام کے بعد
حوصلہ دل کا بڑھا کوششِ ناکام کے بعد

اب خدا جانے تجھے بھی ہے تعلق کہ نہیں
لوگ لیتے ہیں مرا نام ترے نام کے بعد

میکدہ تھا تو وہیں روز چلا جاتا تھا
اب کہاں کوئی ٹھکانا ہے مرا شام کے بعد

کوئی آیا ہی نہیں کوئے وفا تک ورنہ
کچھ بھی مشکل نہیں یہ راہ دو اک گام کے بعد

وقت کٹتا رہا کٹتی رہیں راہیں لیکن
ہم نے مڑ مڑ کے تمہیں دیکھا ہر اک گام کے بعد

کچھ تو ساقی سے گلہ ہو گا حسن کو ورنہ
کون میخانے سے اٹھتا ہے دو اک جام کے بعد

تو نیازِ دل سے پیہم سرگراں ہوتا رہا
میں سبک سر بن کے بارِ آرزو ڈھوتا رہا

دی اذیت لعنتِ احساس نے گو عمر بھر
کچھ ازالہ نعمتِ افکار سے ہوتا رہا

کتنے اشکوں کے دیئے جلتے رہے بجھتے رہے
یوں بظاہر چین سے میں رات بھر سوتا رہا

غم کو غرقِ مے کیا ہوگا کسی نے اے نعیمؔ
میں وہ میکش ہوں جو وقتِ میکشی روتا رہا

○

جان و دل پر بار بن کر ماہ و سال آتے رہے
ہم کسی فردا سے لیکن جی کو بہلاتے رہے

سرخ رو لوٹے چمن سے جن میں تھا جوشِ طلب
وہ تہی داماں اُٹھے، دامن جو پھیلاتے رہے

ایک میں تھا جس نے اپنے سر لیا بارِ جہاں
ورنہ کتنے اہلِ غم آتے رہے، جاتے رہے

تم وہ دانا تھے کہ ہم سے دور تر ہوتے گئے
ہم وہ ناداں تھے کہ، تم سے چھُٹ کے گھبراتے رہے

انگلیاں اُٹھتی رہیں سارے زمانے کی نعیم
بے نیازانہ ہم اپنے ساز پر گاتے رہے

○

حسن کے سحر و کرامات سے جی ڈرتا ہے
عشق کی زندہ روایات سے جی ڈرتا ہے

میں نے مانا کہ مجھے ان سے محبت نہ رہی
ہم نشیں! پھر بھی ملاقات سے جی ڈرتا ہے

سچ تو یہ ہے کہ ابھی دل کو سکوں ہے لیکن
اپنے آوارہ خیالات سے جی ڈرتا ہے

اتنا رویا ہوں غمِ دوست ذرا سا ہنس کر
مسکراتے ہوئے لمحات سے جی ڈرتا ہے

کس گھڑی کونسی وحشت میں کرے مجھکو شریک
عشق کی ایک اسی بات سے جی ڈرتا ہے

جو بھی کہنا ہے کہو صاف شکایت ہی سہی
ان اشارات و کنایات سے جی ڈرتا ہے

ہجر کا درد نئی بات نہیں ہے لیکن
دن وہ گذرا ہے کہ اب رات سے جی ڈرتا ہے

کون بھولا ہے نعیمؔ ان کی محبت کا فریب
پھر بھی ان تازہ عنایات سے جی ڈرتا ہے

فسانۂ غم کا کوئی غم گسار ہو تو کہیں
کہانی دل کی کوئی دل فگار ہو تو کہیں

وہاں یقین کہ خود ہی کہیں گے حرفِ جنوں
یہاں یہ فکر فضا ساز گار ہو تو کہیں

جنوں کی کونسی منزل میں مل رہا ہے سکوں
ہماری طرح کوئی بے قرار ہو تو کہیں

کہیں فسانۂ ہجراں یہ ربطِ ذکرِ وفا
کسی کا اب نہ تمہیں انتظار ہو تو کہیں

اسی میں چھیڑا نہ ہم نے فسانۂ شبِ غم
کہ ان کی شام بھی کچھ سوگوار ہو تو کہیں

وہ مسکرائے کہ برہم ہوئے گزارش پر
جو اپنی آنکھوں پہ کچھ اعتبار ہو تو کہیں

کہانی دورِ جنوں کی کہیں تو کس سے نعیمؔ
جہاں میں ہم سا کوئی غم شعار ہو تو کہیں

یاد کی آنچ سے ہر آن تپاں ہے تو رہے
اب کوئی میرے لیے شعلہ بجاں ہے تو رہے

یادِ امکاں سے ہے سرسبز جنوں کی وادی
کوچۂ عقل میں وحشت کا سماں ہے تو رہے

ہم بھی بے تاب ہیں اب سیر و سیاحت کیلئے
ان کی نظروں میں کوئی تازہ جہاں ہے تو رہے

بس یہی فکر کہ جلتی رہے آتشِ فن
آتشِ رشک سے محفل میں دھواں ہے تو رہے

سر اٹھانے کی کہاں آج مجھے تاب نعیم
وہ کسی چاند کے پیکر میں نہاں ہے تو رہے

نوٹ :- یہ غزل مصنف کے مطابق صفحہ ۱ پر ہونا چاہیے تھی۔ ترتیب میں سہو کے باعث آخر میں رکھی گئی ہے (م خ)